بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنے (الاعتصام) کا مفہوم!

(عربی سے ترجمہ)

https://alwaie.org/archives/article/20567

الوعي میگزین – شمارہ نمبر،484

اکتالیسواں سال، جمادی الاول 1448ھ

بمطابق، اکتوبر 2026ء

تحریر : أیمن صلاح –فلسطین

جب باہمی اتحاد اور اتفاق کی بات ہو تو بہت سے خطیب اور عام لوگ گروہ بندی اور فرقہ واریت کو ترک کرنے کی تلقین کرتے ہوئے، باہم اختلاف رکھنے والے فریقوں کے مابین صلح و مصالحت کی میٹنگوں میں اور اسی طرح کے دیگر مواقع پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس فرمان کا حوالہ دیتے ہیں، ﴿**وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا**﴾ ''اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور آپس میں تفرقے میں نہ پڑو'' [سورۃ آل عمران؛ 3:103]۔ آیت کے مفہوم کے اعتبار سے اس کا حوالہ دینا درست ہے، لیکن اکثر وہ اس آیت کے مکمل معنی اور حقیقی مفہوم کو نہیں سمجھ پاتے۔ چنانچہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ "اعتصام" کا مطلب محض اکٹھے جمع ہو جانا، متحد رہنا اور ایک دوسرے سے الگ نہ ہونا ہے، حالانکہ یہی وہ نکتہ ہے جس میں ان سے غلطی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس آیت میں ایک طرف "اعتصام" کا حکم دیا گیا ہے، یعنی ﴿وَاعْتَصِمُوا﴾ ''اور مضبوطی سے تھام لو'' اور اس کے ساتھ ہی اس آیت میں تفرقے سے منع کیا گیا ہے، یعنی ﴿وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ ''اور آپس میں تفرقے میں نہ پڑو''۔ پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم ایک نہایت عظیم اور جامع حکم ہے، جس میں بے شمار بھلائیاں شامل ہیں۔ اور مسلمانوں کا باہم متحد رہنا اور تفرقے سے بچتے رہنا بھی اسی حکم کا ایک حصہ ہے۔ لہٰذا اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے "اعتصام" کے حقیقی معنی اور مفہوم کو واضح کیا جائے، پھر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کی وہ عملی صورت بیان کی جائے جس پر مسلمانوں کا قائم ہونا ضروری ہے۔

"عصمة" کے معنی حفاظت "منعی" اور بچاؤ کے ہیں، یعنی کسی کو نقصان یا خطرے سے محفوظ رکھنا اور اس کی نگہبانی کرنا۔ جبکہ "اعتصام" کا مطلب پناہ حاصل کرنا یا ایسی حالت میں ہونا ہے جس میں انسان کسی شر، نقصان یا خطرے سے محفوظ اور مامون ہو۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا، ﴿**وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ**﴾ ''اور اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے محفوظ رکھے گا'' [سورۃ المائدۃ؛ 5:67]، یعنی اللہ تعالیٰ آپ کو دشمنوں سے بچائے گا، ان کے شر سے آپ کی حفاظت فرمائے گا اور انہیں آپ کو نقصان پہنچانے سے روک دے گا۔ لہٰذا آپ نہ خوف کھائیں اور نہ غمگین ہوں، کیونکہ ان میں سے کوئی بھی آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿**قُلْ مَنْ ذَا الَّذِي يَعْصِمُكُمْ مِنَ اللَّهِ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ سُوءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً**﴾ ''کہہ دیجئے، کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچا سکتا ہے اگر وہ تمہارے ساتھ کسی برائی کا ارادہ فرمائے یا تمہارے ساتھ کسی رحمت کا ارادہ کرے؟'' [سورۃ الاحزاب؛ 33:17] یعنی کون ہے جو تمہیں اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور اس کے ارادے سے بچا سکتا ہے؟

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا : ﴿**قَالَ سَآوِي إِلَىٰ جَبَلٍ يَعْصِمُنِي مِنَ الْمَاءِ ۚ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَ**﴾ ''اس نے کہا: 'میں ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھے پانی سے بچا لے گا'۔ (نوح علیہ السلام نے) فرمایا: 'آج اللہ کے حکم سے بچانے والا کوئی نہیں سوائے اس کے جس پر وہ رحم فرما دے'' [سورۃ ہود؛ 11:43]

اس آیت میں لفظ ﴿يَعْصِمُنِي﴾ کا مطلب ہے ''مجھے بچا لے گا'' یا ''مجھ تک (نقصان) پہنچنے کو روک دے گا''۔ یہ الفاظ اللہ کے نبی نوح علیہ السلام کے بیٹے نے کہے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ کسی پہاڑ پر پناہ لے لے گا تو طوفان کا پانی اس تک نہیں پہنچ سکے گا اور وہ نقصان سے محفوظ رہے گا۔ لیکن نوح علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا: ﴿لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ﴾ ''آج اللہ کے حکم سے کوئی بچانے والا نہیں''۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آج اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے سے کوئی نہیں بچ سکتا جو اس نے ان لوگوں کو غرق اور ہلاک کرنے کے بارے میں فرما دیا ہے جو ایمان لا کر نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار نہیں ہوئے۔

اسی مفہوم سے انبیائے کرام علیہم السلام کی عصمۃُ کا تصور بھی متعلق ہے۔ عصمتِ انبیاء کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء میں ایک ایسی خصوصی، خداداد صلاحیت اور صفت پیدا فرمائی ہے جو انہیں گناہ کرنے اور اس کی طرف مائل ہونے سے روکتی ہے، باوجود اس کے کہ وہ گناہ کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ پس عصمت سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے انبیاء اور رسولوں کو کبیرہ گناہوں، حکم سے تجاوز اور وحی کی تبلیغ میں غلطی سے محفوظ رکھنا ہے، تاکہ ان کی پیش کردہ حجت ہر قسم کے نقص سے پاک رہے اور ان کی دعوت خالص اور بے عیب ہو۔

چنانچہ "عصمۃُ" کا مفہوم کسی کو تحفظ فراہم کرنا اور اسے نقصان، خطرات اور برائیوں سے محفوظ رکھنا ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿**وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ**﴾ ''اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو'' [سورۃ آل عمران؛ 3:103] میں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ اہلِ ایمان کو حکم دیتا ہے کہ وہ اللہ کی رسی کو اپنے لئے ایسی حفاظت (عاصم) اور پناہ کا ذریعہ بنائیں جو انہیں ان برائیوں، خطرات اور نقصانات سے محفوظ رکھے جن کا انہیں اندیشہ ہوتا ہے۔ بہت سی ایسی برائیاں اور خطرات ہیں جو اہلِ ایمان کو لاحق ہو سکتے ہیں۔ ان میں کفار کی جارحیت، مسلمانوں کے جان و مال کی بے حرمتی اور ان کے علاقوں پر قبضہ کرنا شامل ہے۔ اسی طرح ان خطرات میں اندرونی فتنے اور اختلافات بھی شامل ہیں جو مسلمانوں کو باہم تقسیم کرکے ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔ ان خطرات میں باطل افکار اور فاسد عقائد کا مسلمانوں کے اندر سرایت کر جانا بھی شامل ہے، جو انہیں کفر اور گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اسی طرح کفار کی عادات، ان کے طرزِ عمل اور ان کے رہن سہن کے طریقوں کا مسلم معاشرے میں داخل ہو جانا بھی ان خطرات میں شامل ہے، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے بیٹوں اور بیٹیوں میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور ان کا خاندانی نظام انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا یہ حکم ﴿**وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ**﴾ ''اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو'' ایمان لانے کے بعد دوبارہ کفر میں مبتلا ہونے سے خبردار کرنے کے بعد آیا ہے، کیونکہ اس سے پہلے کی آیات میں اہلِ ایمان کو ایمان کے بعد کفر کی طرف پلٹ جانے سے خبردار کیا گیا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس سے پہلے کی آیات میں فرمایا ہے، ﴿**يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تُطِيعُوا فَرِيقًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ * وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ۗ وَمَن يَعْتَصِم بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ * يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ * وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا**﴾ ''اے ایمان والو! اگر تم اہلِ کتاب میں سے کسی گروہ کی بات مانو گے تو وہ تمہارے ایمان لانے کے بعد تمہیں دوبارہ (حالتِ) کفر میں پھیر دیں گے۔ اور تم کیسے کفر اختیار کر سکتے ہو، جبکہ تمہارے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جا رہی ہیں اور تمہارے درمیان اس کا رسول موجود ہے؟ اور جو شخص اللہ (کی رسی) کو مضبوطی سے تھام لے، تو یقیناً اسے سیدھے راستے کی ہدایت مل گئی۔ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور تمہیں ہرگز موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔ اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور آپس میں تفرقے میں نہ پڑو'' [سورۃ آل عمران؛ 3: 100-103]

پہلی آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اہلِ ایمان کو اہلِ کتاب کے کسی بھی گروہ کی اطاعت کرنے سے منع فرمایا ہے اور واضح کیا ہے کہ ان کی اطاعت انہیں کفر کی طرف لے جا سکتی ہے۔ دوسری آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ اہلِ ایمان کو اس بات سے خبردار فرماتے ہیں کہ وہ اہلِ کتاب سے قوانین اور احکام اخذ کرکے دوبارہ کفر کی طرف نہ لوٹ جائیں، حالانکہ ان کے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے، جس میں ہدایت اور نور ہے اور جس کی آیات انہیں پڑھ کر سنائی جا رہی ہیں، نیز ان کے درمیان اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی موجود ہیں، جن کی طرف وہ پیش آنے والے کسی بھی انسانی مسئلے کے حل کے لئے رجوع کر سکتے ہیں۔یہ آیت اس بات کو بھی واضح کرتی ہے کہ جو شخص اللہ کو مضبوطی سے تھام لیتا ہے، یعنی اللہ کی پناہ اور اس کی مدد حاصل کرتا ہے، وہ سیدھے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔ تیسری آیت میں اہلِ ایمان کو اللہ سے ڈرنے اور تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے، تاکہ انہیں اس حال میں موت نہ آئے کہ وہ نافرمانی یا کفر میں مبتلا ہوں، کیونکہ کافروں کی اطاعت کے نتیجے میں انسان ایسی حالت سے دوچار ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد اعتصام، یعنی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے والی آیت آتی ہے، جو اہلِ ایمان کے سامنے وہ عملی صورت واضح کرتی ہے جس کے ذریعے معاشرے اور پوری امت کو ان برائیوں اور خطرات سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ یہ آیت واضح کرتی ہے کہ اس عملی صورت کے لئے دو امور ضروری ہیں: پہلا: اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنا۔ دوسرا: سب کا مل کر (جمیعاً)، یعنی ایک جماعت (جماعۃ) کی صورت میں، اس رسی کو تھامنا۔ اب یہاں دو اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں: اللہ کی وہ رسی کیا ہے جسے مضبوطی سے تھامنے کے ذریعے مسلمان ان خطرات سے محفوظ رہ سکتے ہیں؟ اور آیت میں لفظ ﴿جَمِيعًا﴾ یعنی ''سب مل کر'' یا ''ایک جماعت کی صورت میں'' ہونے کا کیا مفہوم ہے، جو مسلمانوں کے لئے حفاظت کا ذریعہ ہے؟

لفظ "حبل" (رسی) ایک مشترک اصطلاح ہے، یعنی ایسا لفظ جو متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بعض معنی حقیقی ہیں اور بعض مجازی۔

لغوی اعتبار سے اس کا بنیادی مفہوم ایسا ذریعہ یا وسیلہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنے مطلوبہ مقصد یا ضرورت تک پہنچ سکے۔ عربوں کے ہاں لفظ "حبل" کے حقیقی معانی میں بندھن یا رشتہ، ریشوں یا اسی نوعیت کی دوسری چیزوں کو بٹ کر بنائی جانے والی رسی، جس سے کسی چیز کو باندھا یا کسی جانور کو کھینچ کر لے جایا جاتا ہے، شامل ہیں۔ اسی طرح عربی زبان میں "حبل العاتق" بھی کہا جاتا ہے، جس سے مراد گردن اور کندھے کے درمیان موجود ایک رگ یا ایک رباط (Ligament) ہے۔ اس کے علاوہ "حبل الورید" یعنی گردن کی رگ، اور "حبل الذراع" یعنی بازو کی رگ کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اور لفظ "حبل" کے مجازی معنوں میں اہلِ عرب ''عہد'' یا "پیمان" استعمال کرتے ہیں، جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ﴾ ''ان پر جہاں بھی وہ پائے جائیں ذلت مسلط کر دی گئی ہے، سوائے اس کے کہ اللہ کے عہد (امان) میں آ جائیں اور لوگوں کے عہد میں'' [آل عمران؛ 3:112]، یہاں لفظ "حبل" سے مراد عہد اور تحفظ ہے۔ اسی طرح بیعتِ عقبہ کے موقع پر انصار کے متعلق ایک روایت میں یہ الفاظ منقول ہیں: (إن بيننا وبين الرجال حبالاً، وإنا قاطعوها) ''بے شک ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان کچھ رسیاں ہیں، اور ہم انہیں کاٹ دینے والے ہیں''، یہاں "حبال" یعنی رسیوں سے مراد وہ عہد و معاہدے ہیں جو ان کے اور دوسرے لوگوں کے درمیان قائم تھے۔

اس آیتِ مبارکہ میں "حبل اللہ" (اللہ کی رسی) سے مراد اللہ کا عہد یا قرآنِ کریم ہے۔ اللہ کا عہد وہ ہے جس کو پورا کرنے کا اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں حکم دیا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُواْ بِالْعُقُودِ﴾ ''اے ایمان والو! تمام عقود (عہد و پیمان) کو پورا کرو'' [المائدۃ؛ 5:1]۔ یہاں لفظ "العقود" سے مراد وہ عہد و پیمان ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر عائد کیے ہیں اور جن کی پابندی ان کے لئے لازم قرار دی گئی ہے۔ چنانچہ ہر وہ مسلمان جو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے عہد کو قبول کر چکا ہوتا ہے اور اپنے آپ کو اس عہد کی پابندی کا ذمہ دار بنا لیتا ہے۔ اس عہد کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان ان تمام احکامِ شریعت کو نافذ کرے اور ان پر عمل پیرا ہو جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب قرآنِ کریم اور اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ذریعے نازل فرمائے ہیں۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿بِحَبْلِ اللَّهِ﴾ یعنی ''اللہ کی رسی'' سے مراد قرآنِ کریم ہے، کیونکہ متعدد احادیث میں قرآنِ کریم کے لئے ﴿بِحَبْلِ اللَّهِ﴾ یعنی ''اللہ کی رسی'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان احادیث میں سے ایک وہ حدیث بھی ہے جسے الترمذی نے حارث الاعور کے حوالے سے علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہوئے، قرآنِ مجید کی صفات اور خصوصیات کے بارے میں روایت کیا ہے : «هُوَ حَبْلُ اللهِ الْمَتِينُ، وَصِرَاطُهُ الْمُسْتَقِيمُ» ''یہ اللہ کی مضبوط رسی اور اس کا سیدھا راستہ ہے''۔

اسی طرح عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إنَّ هذا القرآنَ مأدبةُ اللهِ فاقبَلوا مأدُبتَه ما استطعتَم، إنَّ هذا القرآنَ حبلُ اللهِ والنُّورُ المبينُ، والشِّفاءُ النَّافعُ، عصمةٌ لمن تمسَّك به، ونجاةٌ لمن اتَّبعه، لا يزيغُ فيُسْتَعْتَبُ، ولا يَعوَجُّ فيُقوَّمُ، ولا تنقضي عجائبُه، ولا يَخلَقُ من كثرةِ الرَّدِّ» ''بے شک یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ضیافت ہے، لہٰذا جہاں تک تم

سے ہو سکے، اللہ کی اس ضیافت کو قبول کرو۔ بے شک یہ قرآن اللہ کی رسی، روشن نور اور نفع بخش شفا ہے۔ جو شخص اسے مضبوطی سے تھام لے، یہ اس کے لئے حفاظت کا ذریعہ ہے، اور جو اس کی پیروی کرے، یہ اس کے لئے نجات کا ذریعہ ہے۔ یہ قرآن حق سے منحرف نہیں ہوتا کہ اسے دوبارہ درست راستے پر لانے کی ضرورت پڑے، اور نہ ہی اس میں کوئی کجی ہے کہ اسے سیدھا کیا جائے۔ اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوتے، اور بار بار پڑھنے اور دہرانے سے بھی یہ پرانا نہیں ہوتا''۔ (اس حدیث کو حاکم نے "المستدرک علی الصحیحین" میں اور البیہقی نے "شعب الایمان" میں روایت کیا ہے۔ جبکہ المنذری نے اپنی کتاب "الترغیب والترھیب" میں اس روایت کے بارے میں کہا ہے کہ یہ صحیح ہے)۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ "حبل اللہ" یعنی اللہ کی رسی سے خواہ جو بھی معنی مراد لیا جائے، اس کا لازمی تقاضا اللہ کی کتاب، قرآنِ کریم کو مضبوطی سے تھامنا ہے، کیونکہ قرآن ہی وہ مضبوط رسی اور سیدھا راستہ ہے جس کی پیروی کرنا ضروری ہے۔

اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے عہد اور اس کی کتاب میں پناہ اختیار کرے، کیونکہ یہی عہد اور کتاب اسے فتنوں اور گمراہی میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامنے کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام شرعی احکام کو نافذ کیا جائے جن کا تعلق فرد، جماعت اور ریاست سے ہے۔ اور جب ایسا ہوگا تو اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن مجید) فتنوں، برائیوں اور خطرات سے حفاظت کرنے والی بن جائے گی۔ یہ کتاب فرد کو کفر، گمراہی اور بدعات کے فتنوں سے محفوظ رکھے گی، امت کو ہر اس خطرے سے بچائے گی جس کا نشانہ امت اور اس کی ریاست ہو، اور معاشرے کو ان فاسد اور غیر فطری طرزِ عمل اور رویوں کے اثرات سے محفوظ رکھے گی جو کفر پر قائم معاشروں میں رائج ہیں۔ اس آیت نے وہ عملی صورت بھی واضح کی ہے جو امتِ مسلمہ میں موجود ہونی چاہیے، تاکہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کا حقیقی مقصد حاصل ہو اور امت مختلف برائیوں اور خطرات سے محفوظ رہ سکے۔ وہ عملی صورت یہ ہے کہ مسلمان سب مل کر ایک جماعت کی شکل میں ہوں۔ یہ بات ہمیں لفظ ''جماعت'' کے مفہوم پر غور کرنے کی طرف لے جاتی ہے، جو اس غور وفکر کا دوسرا اہم نکتہ ہے۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿**جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا**﴾ **''سب مل کر، اور آپس میں تفرقے میں نہ پڑو''**۔ یہ الفاظ امت کی اس عملی اجتماعی صورت کو واضح کرتے ہیں جس کے ذریعے وہ ہر قسم کی برائی، فتنے اور جارحیت سے حفاظت اور بچاؤ حاصل کر سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ ﴿جَمِيعًا﴾ کا مطلب ہے کہ سب لوگ مل کر ایک جماعت کی صورت میں جمع ہوں۔ چنانچہ اس فرمان کا مفہوم یہ ہے کہ تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کے معاملے میں متحد اور مجتمع رہو۔ ''جماعت'' سے مراد اتحاد و یکجہتی کی ایسی حالت ہے جس میں تفرقہ اور تقسیم موجود نہ ہو۔ اگرچہ لفظ ﴿جَمِيعًا﴾ بذاتِ خود ایک جماعت کی صورت میں متحد ہونے کا مفہوم ادا کرنے کے لئے کافی ہے، لیکن آیتِ مبارکہ نے تفرقے سے صراحتاً منع کرکے اس بات کی مزید تاکید فرما دی ہے، ﴿وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ ''اور آپس میں تفرقے میں نہ پڑو''۔ اس طرح یہ آیت اہلِ ایمان کو حکم دیتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عہد اور اس کی کتاب پر متحد ہو کر ایک ایسی جماعت بنیں جو انہیں تفرقے، انتشار اور گروہ بندی کی برائیوں اور ان کے خطرات سے محفوظ رکھنے والی ہو۔ کیونکہ تفرقہ اور انتشار مسلمانوں کے لئے ہر قسم کے فتنے اور برائی کا سبب بنتے ہیں اور ان کے دشمنوں کو ان کے خلاف جارحیت کرنے اور انہیں نقصان پہنچانے کی جرأت دلاتے ہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اہلِ ایمان کو باہمی محبت، الفت، اتحاد اور اجتماعیت کا حکم دیا ہے اور تفرقے اور انتشار سے منع فرمایا ہے، کیونکہ تفرقہ ہلاکت کا سبب ہے، جبکہ جماعت نجات کا ذریعہ ہے۔ یہ بات متعدد احادیثِ نبوی میں بیان ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک حدیث نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «**الجماعة رحمة والفرقة عذاب**» ''جماعت رحمت ہے اور تفرقہ عذاب ہے'' (اسے احمد، طبرانی اور بیہقی نے روایت کیا ہے)۔ اسی طرح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «**من أراد بحبوحة الجنة فعليه بالجماعة**» ''جو شخص جنت کی وسعتیں اور کشادگی پانا چاہتا ہے، اسے چاہیے کہ جماعت کو لازم پکڑے'' (اسے ترمذی، احمد اور نسائی نے روایت کیا ہے)۔

اللہ ﷻ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت میں ایسے شرعی دلائل موجود ہیں جو جماعت کی اس شرعی صورت کی تفصیلات واضح کرتے ہیں جس کے ذریعے ہر قسم کے شر اور خطرے سے حفاظت حاصل ہوتی ہے۔ ان دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ ''جماعت'' سے مراد پوری امتِ مسلمہ یا امت کا وہ حصہ ہے جس کے سربراہ کے طور پر مسلمانوں کا ایک امام یا حکمران موجود ہو، جو ان پر اسلام کے احکام کے مطابق حکومت کرے، امت نے اس کی بیعت کی ہو اور اس کی اطاعت واجب ہو۔

اس اعتبار سے ''جماعت'' ایک سیاسی اصطلاح ہے جس کا تعلق ریاست اور اس کی سربراہی سے ہے۔ اس اصطلاح کا ایک مخصوص شرعی مفہوم ہے جسے صحیح احادیث نے واضح کیا ہے۔ ان احادیث کے مطابق، جب امام یا خلیفہ موجود نہ ہو تو ''جماعت'' بھی موجود نہیں ہوتی۔ چنانچہ جب امت کسی خلیفہ کی بیعت کر لیتی ہے تو ''جماعت'' وجود میں آ جاتی ہے، لیکن جب تک امت کسی امام یا خلیفہ کی بیعت نہیں کرتی، اس وقت تک اس مخصوص شرعی مفہوم کے مطابق جماعت موجود نہیں ہوتی، بلکہ تفرقے کی حالت برقرار رہتی ہے۔ اس طرح لفظ ''جماعت'' ایک مخصوص شرعی معنی اختیار کر لیتا ہے، جسے اصطلاح میں ''حقیقتِ شرعیہ'' کہا جاتا ہے۔ لہٰذا شرعی نصوص میں جہاں بھی "الجماعة" کا لفظ استعمال ہوا ہے، خواہ وہ معرفہ "ال" (کے ساتھ) ہو، جو کسی مخصوص اور متعین جماعت کی طرف اشارہ کرتا ہے، یا اسے مسلمانوں اور مؤمنوں کی طرف منسوب کرکے استعمال کیا گیا ہو،مثلاً: "جماعة المسلمين" (مسلمانوں کی جماعت)، "جماعة المؤمنين" (مومنوں کی جماعت)، یا "جماعتكم (تمہاری جماعت)، تو اس سے مراد جماعت کی وہ مخصوص شرعی حقیقت ہے جس کی وضاحت پہلے کی جا چکی ہے، نہ کہ محض اس کا لغوی مفہوم، یعنی لوگوں کا کسی جگہ جمع ہو جانا۔

اب ہم ان اہم احادیث کا ذکر کرتے ہیں جو جماعت کو لازم پکڑنے کا حکم دے رہی ہیں یا اس کی خصوصیات بیان کر رہی ہیں۔ انہی احادیث سے اصطلاح ''جماعت'' کا شرعی مفہوم واضح ہوتا ہے۔

فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «**ثَلاثةٌ لا تَسألْ عنهُم: رَجُلٌ فارَقَ الجَماعةَ، وعَصى إمامَه، وماتَ عاصيًا**» ''تین قسم کے لوگوں کے بارے میں مت پوچھو، ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو جماعت سے الگ ہو گیا، اپنے امام کی نافرمانی کی اور اسی نافرمانی کی حالت میں مر گیا'' (اس حدیث کو احمد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور مذکورہ الفاظ انہی کے ہیں۔ اس کے علاوہ بزار اور ابن حبان نے بھی اسے روایت کیا ہے۔) اسی طرح ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : «**مَن خَرَجَ مِنَ الطَّاعةِ**

وفارَقَ الجَماعةَ فماتَ، ماتَ مِيتةً جاهِلِيَّةً» ''جو شخص اطاعت سے نکل گیا اور جماعت سے علیحدہ ہو گیا، پھر اسی حالت میں مر گیا، تو وہ جاہلیت کی سی موت مرا'' (اس حدیث کو مسلم، نسائی، ابن ماجہ اور احمد نے روایت کیا ہے۔) ان دونوں احادیث سے استدلال کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے امام کی نافرمانی کرنے اور اس کی اطاعت سے نکل جانے والے شخص کو جماعت سے علیحدہ ہونے والا قرار دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''جماعت'' سے مراد پوری امتِ مسلمہ یا امت کا وہ حصہ ہے جس کے سربراہ کے طور پر ایک ایسا امام موجود ہو جس کی اطاعت واجب ہو۔ اور اطاعت صرف اسی امام یا خلیفہ کی واجب ہوتی ہے جو شریعت کے احکام کو نافذ کرتا ہو۔ لیکن اگر کوئی ایسا حکمران موجود ہو جو اسلام کے احکام نافذ نہیں کرتا تو اس تشریح کے مطابق وہ سرے سے شرعی امام ہی نہیں ہوتا، اور نتیجتاً وہاں اس مخصوص شرعی مفہوم میں "جماعت" بھی موجود نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امامت یا خلافت سے مراد دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کی عمومی قیادت ہے، جس کا مقصد ریاست کے اندر احکامِ شریعت کو نافذ کرنا اور بیرونی دنیا تک اسلام کی دعوت کو پہنچانا ہے۔ علمائے کرام ان علاقوں کو، جو ایسے امام یا خلیفہ کی سربراہی میں ہوتے تھے جس کے ہاتھ پر بیعت کی جا چکی ہو، "دار العدل" یعنی عدل و انصاف کا علاقہ کہا کرتے تھے۔ جبکہ ان علاقوں کو، جو شرعی طور پر جائز امام کے اقتدار اور اختیار سے باہر ہوتے تھے، "دار البغی" یعنی بغاوت کا علاقہ کہا جاتا تھا، خواہ وہاں کا حکمران اسلام کے احکام ہی کیوں نہ نافذ کر رہا ہو۔ تو پھر اس صورت کے بارے میں کیا کہا جائے گا جب ایسا حکمران، جو جائز امام بھی نہ ہو، اور اسلامی احکام کے بجائے کفر کے احکام اور کفر پر مبنی نظام نافذ کر رہا ہو؟

حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کی حدیث میں، جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے شر اور فتنوں کے بارے میں سوال کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **«دُعاةٌ إلى أبوابِ جَهَنَّمَ، مَن أجابَهم إليها قَذَفوه فيها، قُلتُ: يا رَسولَ اللهِ، صِفْهُم لَنا؟ فقال: هُم مِن جِلدَتِنا، ويَتَكَلَّمونَ بألسِنَتِنا، قُلتُ: فما تَأمُرُني إن أدرَكَني ذلك؟ قال: تَلزَمُ جَماعةَ المُسلِمينَ وإمامَهم، قُلتُ: فإن لَم يَكُنْ لهم جَماعةٌ ولا إمامٌ؟ قال: فاعتَزِلْ تلك الفِرَقَ كُلَّها، ولو أن تَعَضَّ بأصلِ شَجَرةٍ، حتَّى يُدرِكَكَ المَوتُ وأنتَ على ذلك»** ''جہنم کے دروازوں کی طرف بلانے والے پیدا ہوں گے ، جو ان کی بات قبول کرے گا اسے وہ جہنم میں جھونک دیں گے۔ میں نے عرض کیا : یا رسول اللہ! ان کے اوصاف بھی بیان فرما دیجیے ۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ لوگ ہماری ہی قوم و مذہب کے ہوں گے ۔ ہماری ہی زبان بولیں گے ۔ میں نے عرض کیا ، پھر اگر میں ان لوگوں کا زمانہ پاؤں تو میرے لئے آپ کا حکم کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام کے تابع رہنا۔ میں نے عرض کیا اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت نہ ہو اور نہ ان کا کوئی امام ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا پھر ان تمام فرقوں سے اپنے کو الگ رکھنا۔ اگرچہ تجھے اس کے لئے کسی درخت کی جڑیں چبانی پڑیں، یہاں تک کہ تیری موت آ جائے اور تو اسی حالت پر ہو (تو یہ تیرے حق میں ان کی صحبت میں رہنے سے بہتر ہو گا)'' (اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے)۔

یہ حدیث مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام کے ساتھ وابستہ رہنے کا حکم دیتی ہے۔ اس میں جماعت اور امام کو ایک دوسرے کے ساتھ لازم قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بعد حذیفہ رضی اللہ عنہ اس صورتِ حال کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ جب مسلمانوں کی کوئی جماعت ہی موجود نہ ہو، یعنی جب ان کا کوئی امام موجود نہ ہو۔ چنانچہ وہ پوچھتے ہیں: «فإن لَم يَكُنْ لهم جَماعةٌ ولا إمامٌ؟» ''اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت اور کوئی امام ہی موجود نہ ہو تو؟'' حذیفہ رضی اللہ عنہ

کے اس سوال سے واضح ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین یہ بات بخوبی سمجھتے تھے کہ جب مسلمانوں کے سربراہ کے طور پر ایک امام موجود نہ ہو تو وہ شرعی مفہوم میں ایک جماعت نہیں ہوں گے۔ ایسی صورت میں مسلمان مختلف ریاستوں میں تقسیم ہو کر تفرقے کی حالت میں ہوں گے۔ اور سب سے بڑا فتنہ یہ ہوگا کہ ان ریاستوں کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو ''جو جہنم کے دروازوں کی طرف دعوت دینے والے ہوں''۔ اس سے مراد ایسے حکمران ہیں جو اسلام کے احکام نافذ کرنے کے بجائے کفر کے قوانین اور نظام نافذ کرتے ہیں، اور اپنے ذرائع ابلاغ اور ریاستی اداروں کو مسلم ممالک میں غیر اسلامی افکار و ثقافت کی دعوت دینے اور انہیں فروغ دینے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اور ایسی صورتِ حال میں ان میں سے کسی بھی ریاست پر ''جماعت'' کا شرعی مفہوم منطبق نہیں ہوتا۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ فہم تھا کہ ''جماعت'' اسی وقت وجود میں آتی ہے جب امت کسی ایک امام یا خلیفہ کی قیادت پر متحد ہو جائے۔ چنانچہ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے کہ عمرو بن حریث نے سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے، جو عشرۂ مبشرہ میں سے ایک تھے جنہیں جنت کی بشارت دی گئی تھی، سوال کیا: ''کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت موجود تھے؟'' انہوں نے جواب دیا: ''جی ہاں''، پھر عمرو بن حریث نے پوچھا: ''ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کب ہوئی تھی؟'' سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''جس دن رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی، اسی دن۔ کیونکہ مسلمانوں نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ دن کا کچھ حصہ بھی اس حالت میں گزاریں کہ وہ ایک جماعت کی صورت میں نہ ہوں''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صحابۂ رسول سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے نزدیک امت اسی وقت جماعت کی صورت اختیار کرتی ہے جب کسی امام کی بیعت کر لی جائے۔ اسی بات کی تاکید عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ایک فرمان سے بھی ہوتی ہے۔ تمیم الداری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لوگوں نے عمارتیں بلند بنانا شروع کر دیں۔ اس موقع پر عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: «يا مَعْشَرَ الْعُرَيْبِ، الْأَرْضَ الْأَرْضَ، إِنَّهُ لَا إِسْلَامَ إِلَّا بِجَمَاعَةٍ، وَلَا جَمَاعَةَ إِلَّا بِإِمَارَةٍ، وَلَا إِمَارَةَ إِلَّا بِطَاعَةٍ» ''اے عرب کے لوگو! زمین کو مضبوطی سے تھامے رکھو، زمین کو ! بے شک جماعت کے بغیر اسلام نہیں، امارت کے بغیر جماعت نہیں، اور اطاعت کے بغیر امارت نہیں'' (اسے االدارمی نے روایت کیا ہے)۔ اس بات کی ایک اور دلیل، کہ پہلی صدی ہجری کے مسلمانوں میں یہ تصور متفقہ طور پر پایا جاتا تھا، یہ ہے کہ مسلمانوں نے 41 ہجری کو "عامُ الجماعة" یعنی ''جماعت کا سال'' قرار دیا۔ یہ وہ سال تھا جب حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت سے دستبرداری اختیار کر لی تھی۔ اس کے نتیجے میں مسلمان، معاویہ رضی اللہ عنہ کی قیادت پر متحد ہو گئے اور پوری امت کے لئے اب ایک ہی خلیفہ تھا۔ جبکہ اس سے پہلے مسلمانوں کے پاس دو خلیفہ ہو گئے تھے، اس لئے وہ سب ایک جماعت کی صورت میں متحد نہیں تھے۔ اور اللہ تعالیٰ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ پر رحمت فرمائے، جو تبع تابعین میں سے تھے، اپنے زمانے کے ممتاز عالم اور اپنے دور کے پرہیزگار لوگوں کے پیشوا تھے۔ انہوں نے فرمایا:

إنّ الجماعَةَ حَبْلُ اللهِ فَاعْتَصِمُوا ... مِنْهُ بِعُرْوَتِهِ الوُثْقَى لِمَن دَانَا

كَمْ يَدْفَعُ اللهُ بِالسلطَانِ مُعْضِلَةً ... في ديننا رحمَةً مِنْهُ وَدُنْيَانَا

لَولَا الخلافةُ لَمْ تَأْمَنْ لَنَا سُبُلٌ ... وكانَ أَضْعَفُنَا نَهْبًا لِأَقْوَانَا

بے شک جماعت کا قیام اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے سے ہے ...لہٰذا ہمارے دین کو اختیار کرنے والے شخص کو چاہیے کہ وہ اس کے سب سے مضبوط سہارے کو تھام لے

اللہ تعالیٰ حکمران کے ذریعے ہمارے دین اور دنیا کی کتنی ہی مشکلات دور فرما دیتا ہے ... یہ اس کی طرف سے ہم پر ہماری دنیاوی زندگی میں ایک رحمت ہے

اگر خلافت نہ ہوتی تو ہمارے راستے محفوظ نہ رہتے ... اور ہم میں سے کمزور لوگ طاقتور لوگوں کے ظلم و زیادتی کا شکار ہو جاتے

چنانچہ اس تشریح کے مطابق وہ قابلِ مذمت تفرقہ، جس سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے اس فرمان میں منع فرمایا ہے: ﴿**وَلَا تَفَرَّقُوا**﴾ **''اور آپس میں تفرقے میں نہ پڑو''**۔ اس سے مراد امتِ مسلمہ کا متعدد الگ الگ اکائیوں اور ریاستوں میں تقسیم ہو جانا ہے۔ اس مفہوم کی تائید ان صحیح احادیث سے ہوتی ہے جن میں متعدد حکمرانوں کی موجودگی سے منع کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو ایک سے زیادہ خلیفہ یا حکمران رکھنے سے منع کیا گیا ہے:

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **«إِنَّ اللَّهَ يَرْضَى لَكُمْ ثَلَاثًا، وَيَسْخَطُ لَكُمْ ثَلَاثًا: يَرْضَى لَكُمْ أَنْ تَعْبُدُوهُ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا، وَأَنْ تَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا، وَأَنْ تَنَاصَحُوا مَنْ وَلَّاهُ اللَّهُ أَمْرَكُمْ؛ وَيَسْخَطُ لَكُمْ ثَلَاثًا: قِيلَ وَقَالَ، وَكَثْرَةَ السُّؤَالِ، وَإِضَاعَةَ الْمَالِ»** ''بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے لئے تین باتوں کو پسند فرماتا ہے اور تین باتوں کو ناپسند فرماتا ہے۔ اور وہ تمہارے لئے یہ تین باتیں پسند فرماتا ہے: تم صرف اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور آپس میں تفرقے میں نہ پڑو، جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے معاملات کا ذمہ دار بنایا ہے، ان کے ساتھ خیرخواہی کرو۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے تین باتوں کو ناپسند فرماتا ہے : فضول اور بے مقصد باتیں (سرگوشیاں) کرنا، کثرت سے سوالات کرنا، اور مال کو فضول خرچی میں ضائع کرنا'' (اسے مسلم نے روایت کیا ہے)۔

اسی طرح عرفجہ بن شریح رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: «مَنْ أَتَاكُمْ وَأَمْرُكُمْ جَمِيعٌ عَلَى رَجُلٍ وَاحِدٍ، يُرِيدُ أَنْ يَشُقَّ عَصَاكُمْ، أَوْ يُفَرِّقَ جَمَاعَتَكُمْ، فَاقْتُلُوهُ» "جب تمہارے معاملات ا یک شخص پر مجتمع ہوں،اور کوئی شخص تمہارے پاس آکر تمہاری وحدت کو توڑنے یا تمہاری جماعت میں تفریق پیدا کرنے کی کوشش کرے،تو اُسے قتل کر دو"۔ (اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔)

جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا تعلق ہے: «وَأَمْرُكُمْ جَمِيعٌ عَلَى رَجُلٍ وَاحِدٍ» "جب تمہارے معاملات ا یک شخص پر مجتمع ہوں'' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ایک واحد امام کی قیادت میں ایک متحد جماعت کی صورت میں ہو اور جس کی امامت پر سب کا اتفاق ہو۔ چنانچہ اس تشریح کے مطابق جو شخص اس جماعت میں تفرقہ پیدا کرنا چاہے، امت کے اتحاد کو توڑنے اور اس کی اجتماعیت کو منتشر کرنے کی کوشش کرے، اور امت کے لئے ایک سے زیادہ امام مقرر کرنا چاہے، تو حدیث میں ایسے شخص کو قتل کر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ امت کے لئے ایک سے زیادہ امام کا ہونا ممنوع ہے، یعنی امت کا ایک سے زیادہ ریاستوں میں تقسیم ہونا ممنوع ہے۔

اسی طرح عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **«وَمَنْ بَايَعَ إِمَامًا فَأَعْطَاهُ صَفْقَةَ يَدِهِ، وَثَمَرَةَ قَلْبِهِ، فَلْيُطِعْهُ إِنِ اسْتَطَاعَ، فَإِنْ جَاءَ آخَرُ يُنَازِعُهُ فَاضْرِبُوا عُنُقَ الْآخَرِ»** "اورجوشخص امام(خلیفہ) کی بیعت کرے تو اسے اپنے ہاتھ کا معاملہ اور دل کا پھل دے دے (یعنی سب کچھ اس کے حوالہ کردے)،پھر اسے چاہیے کہ وہ حسبِ استطاعت اس کی اطاعت بھی کرے۔اگر کوئی دوسراشخص آئے اور پہلے خلیفہ سے تنازع کرے تو دوسرے کی گردن اڑا دو" (اسے مسلم نے روایت کیا ہے)۔ اس حدیث سے ہم متحد جماعت کا وہ مفہوم سمجھ سکتے ہیں جسے مضبوطی سے تھامنے کا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے۔ اس سے جماعت کے ساتھ وابستہ رہنے اور اس کی یکجہتی کو برقرار رکھنے کی فرضیت بھی واضح ہوتی ہے۔ اسی طرح اس تشریح کے مطابق ہم یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ جو شخص اس جماعت کے متحد ہونے کو توڑنے، اس سے علیحدگی اختیار کرنے یا اس کے خلاف بغاوت کرنے کی کوشش کرے، تو اس کی سزا قتل ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ جب کسی خلیفہ کی خلافت قائم ہو جائے تو اس کے بعد کسی دوسرے شخص کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرنا ممنوع ہے، خواہ دوسرا شخص پہلے خلیفہ سے زیادہ بہتر ہی کیوں نہ ہو۔ اسی بنا پر اس دوسرے شخص کے قتل کا حکم دیا گیا ہے۔

اس حدیث کو مسلم نے تفصیل کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ نے ابتدا میں ان فتنوں، آزمائشوں اور ناپسندیدہ حالات کا ذکر فرمایا جو جماعت کی عدم موجودگی میں پیش آ سکتے ہیں۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلیفہ کے ہاتھ پر کی گئی بیعت کو پورا کرنے اور اس کی اطاعت کرنے کا حکم دیا۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ ایک مقام پر ہم نے قیام کیا۔ ہم میں سے کچھ لوگ اپنے خیمے درست کر رہے تھے، کچھ تیراندازی کی مشق میں مصروف تھے اور کچھ اپنے اونٹوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ اسی دوران رسول اللہ ﷺ کے منادی نے آواز دی: «الصَّلَاةُ جَامِعَةٌ» ''نماز کے لئے جمع ہو جاؤ'' چنانچہ ہم سب رسول اللہ ﷺ کے پاس جمع ہو گئے۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: **«إِنَّهُ لَمْ يَكُنْ نَبِيٌّ قَبْلِي إِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَيْهِ أَنْ يَدُلَّ أُمَّتَهُ عَلَى خَيْرِ مَا يَعْلَمُهُ لَهُمْ، وَيُنْذِرَهُمْ شَرَّ مَا يَعْلَمُهُ لَهُمْ، وَإِنَّ أُمَّتَكُمْ هَذِهِ جُعِلَ عَافِيَتُهَا فِي أَوَّلِهَا، وَسَيُصِيبُ آخِرَهَا بَلَاءٌ وَأُمُورٌ تُنْكِرُونَهَا، وَتَجِيءُ فِتْنَةٌ يُرَقِّقُ بَعْضُهَا بَعْضًا، وَتَجِيءُ الْفِتْنَةُ فَيَقُولُ الْمُؤْمِنُ: هَذِهِ مُهْلِكَتِي، ثُمَّ تَنْكَشِفُ، وَتَجِيءُ الْفِتْنَةُ فَيَقُولُ الْمُؤْمِنُ: هَذِهِ هَذِهِ. فَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يُزَحْزَحَ عَنِ النَّارِ، وَيَدْخُلَ الْجَنَّةَ، فَلْتَأْتِهِ مَنِيَّتُهُ وَهُوَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَلْيَأْتِ إِلَى النَّاسِ الَّذِي يُحِبُّ أَنْ يُؤْتَى إِلَيْهِ، وَمَنْ بَايَعَ إِمَامًا فَأَعْطَاهُ صَفْقَةَ يَدِهِ، وَثَمَرَةَ قَلْبِهِ، فَلْيُطِعْهُ إِنِ اسْتَطَاعَ، فَإِنْ جَاءَ آخَرُ يُنَازِعُهُ فَاضْرِبُوا عُنُقَ الْآخَرِ»** ''مجھ سے پہلے کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس پر یہ ذمہ داری نہ رہی ہو کہ وہ اپنی امت کو اس خیر کی طرف رہنمائی کرے جسے وہ ان کے حق میں بہتر جانتا ہو، اور انہیں اس شر سے خبردار کرے جسے وہ ان کے لئے نقصان دہ جانتا ہو۔ اور بے شک تمہاری اس امت کی عافیت اور سلامتی اس کے ابتدائی دور میں رکھی گئی ہے، جبکہ اس کے آخری دور کے لوگوں کو ایسی آزمائشوں اور ناپسندیدہ حالات کا سامنا کرنا پڑے گا جنہیں تم برا سمجھو گے۔ اور ایسے فتنے آئیں گے کہ ان میں سے ایک فتنہ دوسرے فتنے کو معمولی بنا دے گا۔ ایک فتنہ آئے گا تو مؤمن کہے گا: ''یہ فتنہ مجھے ہلاک کر دے گا''۔ پھر وہ فتنہ ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد دوسرا فتنہ آئے گا تو مؤمن کہے گا: ''یہی (وہ فتنہ) ہے، یہی (وہ ہلاکت) ہے!''۔ پس جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اسے جہنم کی آگ سے دور کر دیا جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے، تو اسے چاہیے کہ اس کی موت اس حال میں آئے کہ وہ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو۔ اور اسے چاہیے کہ وہ لوگوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرے جیسا سلوک وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

اورجوشخص امام(خلیفہ) کی بیعت کرے تو اسے اپنے ہاتھ کا معاملہ اور دل کا پھل دے دے (یعنی سب کچھ اس کے حوالہ کردے)،پھر اسے چاہیے کہ وہ حسبِ استطاعت اس کی اطاعت بھی کرے۔اگر کوئی دوسراشخص آئے اور پہلے خلیفہ سے تنازع کرے تو دوسرے کی گردن اڑا دو"۔ (صحیح مسلم)

لہٰذا اس حدیث سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ امتِ مسلمہ کو ان فتنوں، آزمائشوں اور ناپسندیدہ حالات سے محفوظ رہنا، جو لوگوں کی تباہی کا سبب بنتے ہیں اور جن میں سے بعض فتنے دوسرے فتنوں کی شدت کو نسبتاً ہلکا ظاہر کر دیتے ہیں، اور امت کی وحدت کو مضبوطی سے قائم رکھنا اس بات سے وابستہ ہے کہ امت میں ایک سے زیادہ ریاستوں اور ایک سے زیادہ اماموں کی موجودگی کی ہرگز اجازت نہ دی جائے۔ چنانچہ اس تشریح کے مطابق، جب امتِ مسلمہ کے پاس پہلے ہی ایک ریاست اور ایک ایسا خلیفہ موجود ہو، جس کے ہاتھ پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کتاب، قرآنِ مجید، اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق حکومت کرنے کی بیعت کی جا چکی ہو، تو اس کے بعد جو بھی شخص خلیفہ بننے اور مسلمانوں کے لئے ایک الگ ریاست قائم کرنے کی کوشش کرے، تو اسے لازماً روکا جائے، اور اگر حالات اس کا تقاضا کریں تو اسے قتل کرکے بھی روکنے کا حکم ہے، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ اور اگر کسی دوسرے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی جائے اور ایک دوسری ریاست قائم ہو جائے، جو امت کی متحد جماعت اور پہلی ریاست کے مقابل کھڑی ہو، تو ایسا ہونا فتنوں اور آزمائشوں کا دروازہ کھول دے گا۔ اس کے نتیجے میں ایسے فتنے جنم لیں گے جن میں سے بعض کی شدت دوسروں کے مقابلے میں اتنی زیادہ ہوگی کہ پہلے فتنے نسبتاً معمولی محسوس ہونے لگیں گے۔ اور یہ سب امت میں تفرقے اور متحد جماعت کی عدم موجودگی کا نتیجہ ہوگا۔ اور یہ حدیث امتِ مسلمہ کی اس موجودہ صورتِ حال کے حوالے سے ہے کہ جب مسلمانوں پر کوئی ایک ایسا امام موجود نہیں ہے جو اسلام کے مطابق حکومت کرتا ہو، بلکہ اس کے برعکس درجنوں حکمران اور الگ الگ ریاستیں بن چکی ہیں۔ اور اسی صورتِ حال کا یہ نتیجہ ہے کہ امتِ مسلمہ اپنا وقار اور عزت کھو بیٹھی ہے، دنیا بھر میں اس کی توہین میں اضافہ ہوا ہے اور غیر مسلم طاقتوں کو ہر طرف سے اس امت پر چڑھائی کرنے اور غلبہ حاصل کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ یہاں تک کہ مسلم ممالک کے مشرق و مغرب میں مسلمانوں کے خون کی حرمت پامال کی جا رہی ہے اور ان کی سرزمین کی بے حرمتی کی جا رہی ہے۔

اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنا، یعنی ایسی جماعت قائم کرنا جس کی قیادت کے طور پر ایک ایسا امام (خلیفہ) موجود ہو جو شریعت کے احکام نافذ کرے، تو یہ اس نجات یافتہ فرقے (الفرقة الناجية) کی صفت ہے جس کا ذکر امت کو فرقوں (افتراق) میں تقسیم ہونے سے متعلق حدیث میں آیا ہے۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے تفرقے (التفرق) اور انتشار سے خبردار فرمایا ہے، جو جماعت اور اجتماعیت کی ضد ہے۔ یہ حدیث مختلف روایات میں متعدد اسناد سے مروی ہے، اور ان میں سے کوئی بھی روایت سند کے ضعف سے خالی نہیں۔ ان میں سے بعض روایات، جو ممکن ہے سند کے اعتبار سے نسبتاً بہتر ہوں، وہ ہیں جن میں ''جماعت'' کو نجات یافتہ فرقے کی صفت قرار دیا گیا ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں : **«أَلَا إِنَّ مَنْ قَبْلَكُمْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ افْتَرَقُوا عَلَى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِينَ مِلَّةً، وَإِنَّ هَذِهِ الْمِلَّةَ سَتَفْتَرِقُ عَلَى ثَلَاثٍ وَسَبْعِينَ، ثِنْتَانِ وَسَبْعُونَ فِي النَّارِ، وَوَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ، وَهِيَ الْجَمَاعَةُ»** ''بے شک! تم سے پہلے اہلِ کتاب بہتر (72) فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے، اور یہ امت تہتر (73) فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ ان میں سے بہتر (72) فرقے آگ میں ہوں گے اور ایک ہی فرقہ ایسا ہو گا جو جنت میں ہوگا، اور وہ الجماعة ہے''۔ ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے

ہیں: «كُلُّهَا فِي النَّارِ إِلَّا وَاحِدَةً» ''...ان میں سے ایک کے سوا باقی سب آگ میں ہوں گے''۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: «مَنْ هِيَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟» ''یا رسول اللہ! وہ کون سا فرقہ ہوگا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي» ''وہ جو اس طریقے پر ہوگا جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں'' (اس حدیث کو امام احمد، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے روایت کیا ہے)۔

امت کے فرقوں میں تقسیم ہونے اور نجات یافتہ فرقے سے متعلق یہ حدیث ان احادیث میں شامل نہیں جن کی صحت بالکل واضح اور غیر متنازع ہو، یا جن کی صحت ائمۂ حدیث اور حفاظِ حدیث کے نزدیک مشہور و مسلم ہو۔ بلکہ اس حدیث کے ثابت ہونے کے بارے میں محدثین اور حفاظِ حدیث کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض محدثین اس حدیث کی تمام روایات کو ضعیف قرار دیتے ہیں، جبکہ بعض دوسرے محدثین مختلف روایات کی بنیاد پر اسے تقویت دیتے ہیں اور قابلِ قبول سمجھتے ہیں۔ اور یہی دوسرا مؤقف، یعنی حدیث کو تقویت دینے کا مؤقف، متأخرین حفاظِ حدیث کے ہاں زیادہ مشہور اور نمایاں ہے۔ یہ حدیث متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت ہوئی ہے، جن میں ابو ہریرہؓ، انس بن مالکؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ یعنی صحابۂ کرام کی ایک جماعت نے اسے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے۔ تاہم اس حدیث کے اختلاف کے بارے میں سب سے بڑا مسئلہ وہ اضافی الفاظ ہیں جو بعض روایات میں آئے ہیں: «كُلُّهَا فِي النَّارِ إِلَّا وَاحِدَةً» ''ان میں سے ایک کے سوا باقی سب آگ میں ہوں گے''۔ ان الفاظ کے بارے میں ابن حزمؒ اور بعض دوسرے علماء نے اس حد تک اعتراض کیا ہے کہ انہیں قابلِ قبول نہیں سمجھا۔ جبکہ ابن تیمیہؒ اور بعض دوسرے علماء نے ان الفاظ پر مشتمل روایت کو تقویت دی ہے اور اسے قابلِ قبول قرار دیا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ فقہ اور اصولِ فقہ کے جن ائمہ (أئمة الفقه والأصول) نے اس حدیث کو، بشمول ان الفاظ کے کہ ''ایک کے سوا باقی سب آگ میں ہوں گے''، قبول کیا ہے، انہوں نے اس کا وہ ظاہری مفہوم مراد نہیں لیا جو عام لوگوں کے ذہن میں آتا ہے۔ یعنی انہوں نے اس حدیث کا مطلب یہ نہیں سمجھا کہ ان فرقوں سے تعلق رکھنے والے تمام لوگ کافر ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ بلکہ ان ائمہ نے اس حدیث کو گناہوں، نافرمانیوں اور دینی بدعات (عصيان وبدعة) کے ارتکاب پر وعید، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت تنبیہ اور عذاب کی دھمکی کے معنی میں لیا ہے۔

یہاں ایک اہم بات ہے جسے ہماری اس بحث میں پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے، اور وہ یہ کہ اس حدیث کی صحت یا عدمِ صحت کے بارے میں کسی قطعی نتیجے تک پہنچنا ضروری نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کا قطعی فیصلہ کر لینا اس تحقیق میں زیرِ بحث مسائل کو ثابت کرنے کے لئے کوئی فیصلہ کن نتیجہ فراہم نہیں کرتا۔ کیونکہ آج امتِ مسلمہ میں تفرقہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اسے نظرانداز کیا جا سکتا ہے، خواہ رسول اللہ ﷺ نے اس تفرقے کی پیشگی خبر نہ بھی دی ہوتی۔

اس حدیث میں یہ بھی واضح نہیں کیا گیا کہ امت میں تفرقہ کس زمانے میں واقع ہوگا۔ اسی وجہ سے تاریخ کے مختلف ادوار میں لکھنے والے علماء اپنے اپنے زمانے میں تفرقے کو موجود سمجھتے رہے ہیں۔ بعض علماء نے مختلف فرقوں کی تعداد شمار کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے بعض ہر قسم کے فکری اور نظریاتی اختلاف کو ایک الگ فرقہ تصور کرتے تھے، تاکہ فرقوں کی تعداد ستر سے کچھ زیادہ تک پہنچ جائے۔ جبکہ بعض دوسرے علماء کا خیال تھا کہ حدیث میں مذکور تعداد سے کوئی مخصوص عدد مراد نہیں، بلکہ اس کا مقصد صرف فرقوں کی کثرت کو ظاہر کرنا ہے۔ یہ اختلاف دراصل اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ علماء کے درمیان خود تفرقے

کے مفہوم کو سمجھنے میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ ان میں سے اکثر علماء کے نزدیک تفرقے سے مراد مختلف بدعات، افکار، مذاہب اور جماعتوں کا وجود تھا۔ اور چونکہ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ نجات یافتہ فرقہ (الفرقة الناجية) "الجماعة" کا ہے، اس لئے بعض علماء نے ''جماعت'' کی تشریح "السواد الاعظم" یعنی مسلمانوں کی بڑی اکثریت اور امت کی غالب جماعت کے طور پر کی۔ مزید یہ کہ یہ حدیث امتِ محمد ﷺ کے اندر پیدا ہونے والے تفرقے کے بارے میں ہے۔ اس میں ان گروہوں کا ذکر نہیں جو اسلام سے خارج ہو چکے ہوں، کیونکہ وہ امتِ مسلمہ کا حصہ ہی نہیں رہتے۔ لہٰذا یہ کہنا ضروری نہیں کہ اگر جماعت ہی نجات یافتہ فرقہ ہے تو اس کے علاوہ باقی تمام فرقے کافر ہیں۔ بلکہ وہ امام کی اطاعت سے نکلنے کی وجہ سے گناہ گار ہیں، نہ کہ لازماً کافر۔ اسی وجہ سے اہلِ سنت کے علماء نے ان بیشتر کلامی اور سیاسی فرقوں کو کافر قرار نہیں دیا جو تاریخ کے مختلف ادوار میں بڑی تعداد میں وجود میں آئے تھے۔ اس زمانے میں اہلِ سنت ہی مسلمانوں کی غالب اکثریت، یعنی "السواد الاعظم " تھے۔ اور ابتدائی اسلامی صدیوں میں ''جماعت'' کی یہ تشریح درست تھی، کیونکہ اس دور میں جماعت کا امام یا حکمران بھی اہلِ سنت میں سے ہوتا تھا۔

اوپر پہلے ہی یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ ''جماعت'' سے مراد وہ امت ہے جس کے سربراہ کے طور پر ایک ہی امام موجود ہو، جبکہ تفرقے سے مراد مسلمانوں کے لئے ایک سے زیادہ اماموں یا حکمرانوں کا وجود ہونا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی فہم اس بات کا سبب بنا کہ ابتدائی اسلامی ادوار میں مسلمان ''اہلِ سنت'' کی اصطلاح استعمال کرتے تھے، نہ کہ ''اہلِ سنت والجماعت'' کی۔ اس زمانے میں ''اہلِ سنت'' کی اصطلاح مسلمانوں کے اس بڑے اور غالب طبقے کے لئے استعمال ہوتی تھی جو معتزلہ، جبریہ اور قدریہ جیسے علمِ کلام کے مختلف مکاتبِ فکر کے مقابلے میں تھا، یا امامیہ اور زیدیہ جیسی سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں اپنی الگ شناخت رکھتا تھا۔ جس دور میں علمِ کلام کے مختلف مکاتبِ فکر پھیل رہے تھے، اس زمانے میں خلیفہ اور ریاست بھی ان فرقوں کے کلامی نظریات کو اختیار کرتے رہے۔ یہ بات معروف ہے کہ متعدد عباسی خلفاء نے عقائد اور علمِ کلام سے متعلق مسائل میں معتزلہ کے نظریات اختیار کیے تھے۔ چنانچہ اس دور میں امت کی سربراہی یا خلافت ''اہلِ سنت'' کے ہاتھ میں نہیں تھی، بلکہ اہلِ سنت خود ''جماعت'' کا ایک حصہ تھے، اس کی قیادت ان کے پاس نہیں تھی۔ لیکن بعد میں جب خلفاء نے اپنے سابقہ نظریات سے رجوع کیا، معتزلہ کے افکار کو ترک کر دیا اور ''اہلِ سنت'' کے نظریات اختیار کر لئے، تو لوگوں نے ''اہلِ سنت والجماعت'' کی اصطلاح استعمال کرنا شروع کر دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اب جماعت کی قیادت، یعنی خلافت، ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی تھی جو اہلِ سنت کے نظریات کے پیروکار تھے۔ اس طرح اہلِ سنت کو حکمران ''جماعت'' کا نمائندہ سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ ''اہلِ سنت والجماعت'' کی اصطلاح کا استعمال نسبتاً بعد کے زمانے میں شروع ہوا۔ اور زیادہ قرینِ قیاس بات یہ ہے کہ ''اہلِ سنت والجماعت'' کی اصطلاح سب سے پہلے "الأشاعرة" نے استعمال کی تھی۔

آج امتِ مسلمہ کی صورتِ حال پر غور کیا جائے تو واضح طور پر نظر آتا ہے کہ امت میں وہ تفرقہ موجود ہے جو ''جماعت'' کے سیاسی اور شرعی مفہوم کی ضد ہے۔ یہ تفرقہ اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان درجنوں الگ الگ سیاسی اکائیوں اور ریاستوں میں تقسیم ہیں اور کسی ایک امام یا خلیفہ کی قیادت پر متحد نہیں ہیں۔ بلکہ آج مسلمانوں کا سرے سے کوئی ایسا امام یا خلیفہ موجود ہی نہیں جس کی شرعی بنیادوں پر بیعت کی گئی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان سیاسی وحدتوں میں سے کسی کے بھی سربراہ کی اس بنیاد پر بیعت نہیں کی گئی کہ وہ اسلام کے احکام

کے مطابق حکومت کرے گا، خواہ اس سربراہ کو صدر کہا جاتا ہو، بادشاہ، امیر، ولیِ فقیہ، کسی تحریک کا قائد یا کوئی بھی اور نام دیا جاتا ہو۔ چنانچہ آج مسلمان ایک جماعت کی صورت میں موجود نہیں ہیں، اور ان سیاسی اکائیوں میں سے کسی میں بھی ''جماعت'' اپنے مخصوص سیاسی اور شرعی مفہوم کے اعتبار سے موجود نہیں ہے۔

اس وقت مسلمان ستر سے زیادہ سیاسی اکائیوں یا نیم خودمختار سیاسی اکائیوں میں تقسیم ہیں۔ ان میں 57 ریاستیں وہ ہیں جو اسلامی تعاون تنظیم (OIC) کی رکن ہیں۔ اس کے علاوہ ان ممالک اور بعض دوسرے ممالک میں تقریباً بیس ایسی علیحدگی پسند سیاسی اکائیاں یا نیم خودمختار اکائیاں بھی موجود ہیں جو الگ سیاسی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس اعتبار سے امتِ مسلمہ میں آج تفرقے کی وہ صورت واضح طور پر نظر آ رہی ہے جس کا ذکر امت کے فرقوں میں تقسیم ہونے سے متعلق حدیث میں آیا ہے۔ لہٰذا، موجودہ زمانے میں کسی بھی ملک کے کسی مخصوص مذہبی گروہ یا مسلک کے لئے "الجماعة" کی اصطلاح استعمال کرنا بے معنی ہے، کیونکہ اس کے بیان کردہ شرعی اور سیاسی مفہوم کے مطابق آج ''جماعت'' موجود ہی نہیں ہے۔ اس لئے درست بات یہ ہے کہ صرف ''اہلِ سنت'' کی اصطلاح استعمال کی جائے، نہ کہ ''اہلِ سنت والجماعت''۔

چونکہ نجات یافتہ فرقے (الفرقة الناجية) سے متعلق حدیث میں بتایا گیا ہے کہ نجات یافتہ فرقہ ''جماعت'' ہے، اس لئے یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے مطابقت رکھتی ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ ''اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور آپس میں تفرقے میں نہ پڑو'' [سورة آل عمران؛ 3:103]۔ یہ آیت واضح کرتی ہے کہ مختلف فتنوں سے نجات اور حفاظت، نیز کفار کے غلبے اور امتِ مسلمہ کے خلاف ان کی جارحیت سے بچاؤ، اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے ہی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کی عملی صورت یہ ہے کہ ایک ایسی جماعت قائم کی جائے جس کی قیادت کے طور پر ایک امام موجود ہو، جو شریعت کے احکام نافذ کرتا ہو۔ یہ مفہوم اس صحیح حدیث سے بھی مطابقت رکھتا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «وإنَّما الإمامُ جُنَّةٌ يُقاتَلُ مِن ورائِه ويُتَّقى به» "بے شک امام (خلیفہ) ڈھال ہے جس کے پیچھے رہتے ہوئے لڑا جاتاہے اور اسی کے ذریعے تحفظ حاصل ہوتا ہے" (اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔) اسی طرح یہ مفہوم ان احادیث سے بھی مطابقت رکھتا ہے جن میں ایک سے زیادہ اماموں کے ہونے سے منع کیا گیا ہے۔

اگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد اس بات کو ناپسند کیا تھا کہ وہ دن کا کچھ حصہ بھی اس حالت میں گزاریں کہ ان کی کوئی جماعت موجود نہ ہو، اور اسی لئے انہوں نے فوراً خلیفہ کی بیعت کی کوشش کی، یہاں تک کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت پر اکٹھے ہو گئے، تو آج کے مسلمانوں کے لئےبھی ازحد ضروری ہے کہ وہ اس معاملے کو اپنی زندگی اور مستقبل کا بنیادی اور فیصلہ کن مسئلہ سمجھیں۔ یعنی ان کی بنیادی اور فیصلہ کن ترجیح ''جماعت'' کا قیام اور ایک ایسے امام و خلیفہ کی تقرری کے لئے لازمی کوشش کرنا ہونی چاہیے جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق حکومت کرے۔ کیونکہ تمام مسلمان ایک ہی دین کے پیروکار ہیں، ایک ہی رب کی عبادت کرتے ہیں، ان کا رسول (ﷺ) بھی ایک ہے اور ان کی کتاب بھی ایک ہے۔ صرف اسی طریقے سے مسلمانوں کو حقیقی قوت اور تحفظ حاصل ہوگا، وہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے

تھامنے (اعتصام) کے تقاضے پورے کر سکیں گے، اور اقوامِ عالم میں ان کی کھوئی ہوئی ہیبت، عزت اور مقام دوبارہ بحال ہو سکے گا۔